Article

An Intellectual Review of Saleem Kausar's Poetry

سلیم کوثر کی شاعری کا فکری جائزہ

Muhammad Yousaf[*1]
Phd Scholar,Deptt of Urdu, MY University, Islamaabad

1 محمد یوسف
پی ایچ-ڈی اسکالر، شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی اسلام آباد

Naimat Ullah*[2]
Phd Scholar,Deptt of Urdu, MY University, Islamaabad

2 نعمت اللہ
پی ایچ-ڈی اسکالر، شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی اسلام آباد

Nagina Nazir*[3]
Phd Scholar,Deptt of Urdu, MY University, Islamaabad

3 نگینہ نذیر
پی ایچ-ڈی اسکالر، شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی اسلام آباد

Correspondance: mna.ghummans@gmail.com

eISSN:3005-3757
pISSN: 3005-3765

Received: 30-06-2023
Accepted:14-09-2023
Online:30-09-2023

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Saleem Kausar was born on Friday 24 October 1947 in Panipat. He obtained the degree of Urdu Fazil from Sindh Board. He wrote his first poem in matriculation, titled Government High School Khanewal. This poem was published in the school magazine. In this article, the intellectual evaluation of Saleem Kausar's poetry has been done. Saleem Kausar is one of the important poets of Pakistan. His style is simple. In his poetry, themes such as pain and sorrow, love, memories, dreams, separation, sadness, waiting, hope and current issues are found. Salim Kausar's poetry reflects his personality and character. He has experimented with genres of speech like poems, ghazals, hymns, naats and minqbats.

KEYWORDS: Poem, Magazine, Poetry, Theme, Pain, Love, Memories, Dreams, Ghazal

سلیم کوثر آج کے اس جدید دور میں اُردو غزل کا وہ عظیم نام ہے جو ایک طرف تو اُردو غزل کی تمام تر روایات کا امین ہے اور دوسری طرف جدیدیت و مابعد جدیدیت کے بڑے بڑے رجحانات کا علمبر دار بھی ہے۔ سلیم کوثر نے اُردو غزل کو بتدریج ارتقائی مراحل سے گزار کر کری و فنی محاسن سے سجایا ہے۔ انھیں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا موقع ملا اور جب اُنھوں نے اپنی مشہور غزل "میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے" پڑھی تو اُن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور وہ دنیا بھر میں اُردو دان طبقے میں غزل گو شاعر کے نام سے امر ہو گئے۔

سلیم کوثر کو اتنا تو یاد نہیں کہ ان کی پیدائش کا دن ۲۳ اکتوبر تھا یا ۲۴ را کتوبر ہاں البتہ ان کا کہنا ہے کہ اس روز یوم حج تھا۔ اس تضاد کو دور کرنے کے لیے تقویم ہی مستند سہارا ہے۔ چنانچہ حج اکبر (۱۳۶۶ھ) بروز جمعہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ سکالر عتیق الرحمان نے بھی اسی تاریخ کو متعین کیا ہے۔

سلیم کوثر ۲۴ را کتوبر ۱۹۴۷ء کو بروز جمعہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔(1)

جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا تو اس وقت لاکھوں مسلمان پاکستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ۔لاکھوں لقمہ اجل بنے۔ پانی پت میں سلیم کوثر کی حویلی پر بھی مسلح حملہ ہوا اور ان کے خاندان کے اہم فرد مرزا محمد شریف نے جام شہادت نوش کیا۔ چنانچہ مرزا غلام نبی اپنے پورے خاندان سمیت پانی پت اسٹیشن سے پاکستان کی طرف آنے والی ٹرین میں سوار ہوئے۔ اس وقت سلیم کوثر محض بارہ دن کے تھے۔ یعنی ان کا خاندان ۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو پانی پت سے جھنگ پہنچا۔ سلیم کوثر کے دادا بھی اس قافلے میں شامل تھے اور انہوں نے جھنگ کے محلہ شیخ لاہوری میں ایک خالی حویلی میں سکونت اختیار کر لی۔

فکر و فن ساتھ ساتھ ہوں تو سو جلا پاتے ہیں۔ فکر کے بغیر فنی محض لفاظی اور متاع کارتی ہے۔ یہ عظیم شام ے اصلی گروہ عیاں کی ہی بدولت عظمت کی بلندیوں کو چھوا ہے۔ تصوف ہو یا روز مرہ کے بانی موضوعات، عدیہ بات بر مابعد جدیدیت، نحوی فکر اور خیال کے بغیر سب بے معنی ہوتا ہے۔ میر تقی میر ہوں یا غالب، حسرت موہانی ہوں یا اقبال، ناصر کاظمی ہوں یا فیض ، میر ہوں یا مجید امجد ہر ایک کے ہاں فکر و خیال ہی کی بدولت عظمت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ سلیم کوثر کے ہاں فکر و خیال کی ٹھوس بنیادیں ملتی ہیں اور ان بنیادوں کے مواد میں روائتی تصوف بھی ہے، سماجی و سیاسی موضوعات بھی اور جدیدیت و مابعد جدیدیت جیسے ذہنی رویہ جات بھی، ترقی پسندیت بھی ہے اور روات پسندی، حقیقت پر ستی، امثالیت پسندی، رومانویت اور سیاسی و عصری شعور بھی ہے۔

حقیقت پسندی:

سلیم کوثر بلا کے حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ خصوصاً سماجی و سیاسی رویوں کی عکاسی میں انھوں نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ شاعر لفظ کے ذریعے اپنے احساس و ادراک اور شعوری نتائج یا تجربات کو مادی شکل دیتا ہے۔ وہ حالات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ الفاظ محض حروف کی صوتی یا مکتوبی ترتیب نہیں رہ جاتے بلکہ کوئی نہ کوئی ایسا منظر نامہ ساتھ لے آتے ہیں جو حقائق کی مادی دنیا کے متوازی ایک نے جہان معنی کو اوپر کرتا ہے۔ الفاظ اپنی ترتیب میں شاعر کے اس داخلی منظر نامے کو سامنے آتے ہیں جس کا تماشائی خود شاعر ہوتا ہے۔ شاعر جب اس منظر نامے کو الفاظ کا روپ دیتا ہے تو قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کے تمام رنگ بادی حقائق کی دنیا سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، اگر معاشرے میں علم نا انصافی اور عدم مساوات کا دور دورہ ہے تو شاعر کا رمانی جہان شعر بھی حقائق کی اس صورت پذیری سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اس حوالے سے اگر سلیم کوثر کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزلوں میں حقیقت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ غلام حسین ساجد، سلیم کوثر کی حقیقت پسندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم کوثر اپنی مٹی سے پیوستہ شاعر ہے، شائد یہی وجہ ہے کہ زبان و بیان اور موضوعات کی کا پر کوئی تجربہ نہ کرنے کے باوجود اپنے عہد کا ایک محبوب شاعر ہے اور اس کی محبوبیت کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے"(2)

سلیم کوثر کی اکثر غزلیں کراچی کے سیاسی و سماجی ماحول کا حقیقت پرستانہ احاطہ کرتی ہیں۔ کراچی میں گزشتہ چند دہائیوں سے دہشت گردی اور قتل وغارت کا جو بازار گرم رہا اور خوف وہراس کی جو کیفیات پیدا ہوئیں ان کا حقیقت پرستانہ بیان تو ملاحظہ کیجئے۔

اور کچھ دن جو میں خوف کا عالم ہے تو پھر
نہ دعائیں کوئی دے گا نہ سلام آئے گا (2)

سلیم کوثر کی شاعری میں احتجاج کی آواز ہر مظلوم کے دل پر اثر کرتی ہے۔ انسانیت سے ہمدردی رکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتی ہے۔ حقیقت پسندی کے حوالے سے سلیم کوثر کا جوش و خروش ان کی غیر معمول ہمت اور مردانگی کا ثبوت ہے۔ ان کے ہاں انقلاب کے سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ دشمن سے برسرپیکار ہونے پر ہر لمحہ آمادہ ہیں۔

پاکستانی سماج میں سیاست رچ بس چکی ہے۔ حالاں کہ حقیقی جمہوریت کی منزل کوسوں دور ہے۔ ہر فرد اہے نہیں سیاست میں ملوث ہے۔ سلیم کوثر نے اس اہم سماجی رویے کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کس قدر سادگی سے پیش کر دیا ہے۔ سلیم کوثر ایک حقیقت پسند شاعر ہیں یہاں تک کہ ان کی یہ حقیقت پسندی رومان کے نہاں خانوں میں بھی موجود رہتی ہے ان کی شاعری کی ساری فضا ایک سوگوار سا تاثر ضرور پیدا کرتی ہے اس حوالے سے سلیم کوثر کی غزل سے منفرد مثال ملاحظہ کریں:

ہم لوگ تو خوشبو کی طرح ہیں تیرے اطراف
ہم سادہ دلوں سے تو سیاست نہیں کرتے (3)

سلیم کوثر کے ہاں جس حقیقت پسندی کا ثبوت ملتا ہے وہ اکثر شعرا کے ہاں تو شائد ناپید ہے، میر کے ہاں اگر شہر آشوب ملتے ہیں اور زوال پذیر مسلم معاشرت کے نوحے ملتے ہیں تو ان کا زیادہ تعلق ان کی اپنی داخلیت اور ذاتی زندگی کی کمپرسی سے ہے جبکہ غالب و مومن کے دور کے اکثر شعرا کے ہاں ایسی حقیقت پسندی موجود نہ ہے ہاں البتہ حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی کے ہاں تحریک علی گڑھ کے اثرات حقیقت پسندی کی شکل میں ملتے ہیں۔ اسی طرح سے بیسویں صدی کے پہلے ربع کے شعرا کے ہاں بلا کی حقیقت پسندی کے مرقعے ملتے ہیں لیکن یہ عرصہ نظم نگاری کے غالب رجحان کی نذر رہا ہے ترقی پسندوں کی وجہ سے متاخرین کے ہاں بھی بلا کی حقیقت پسندی ملتی ہے۔ لیکن قیام پاکستان سے لے کر آنے والی تقریبا دو دہائیوں تک تقسیم، ہجرت و فسادات ہی موضوعات ٹھہرے چنانچہ وہ حقیقت پسندی نظر نہ آسکی جو 1980 کی دہائی کے بعد سلیم کوثر اور دیگر شعرا کے ہاں ملتی ہے۔ افتخار عارف، عارف عبدالمتین، احمد ندیم قاسمی کے ہاں حقیقت پسندی کے اعلی مرقعے ملتے ہیں۔ جب سلیم کوثر کا طوطی بولنا شروع ہوا تو اس کی بڑی وجہ ان کے جذبات کی سچائی، خلوص اور دیانت داری کی ساتھ ساتھ ان کی حقیقت پسند ہی تھی اس معاملے میں وہ اپنے ہمعصر شعرا سے دو قدم آگے نظر آتے ہیں۔

رومانویت

رومانویت ایک وسیع و عریض اصطلاح ہے کہ جسے دنیائے ادب میں مختلف ادوار میں مختلف انداز میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ یہ بظاہر کلاسکیت کے متضاد ہے۔ اگر کلاسیکل ادب کو روائتی اصول وضوابط کا پابند سمجھا جائے تو رومانویت سے مراد روائتی

اصولوں سے بغاوت ہے۔ انگریزی ادب میں ورڈزورتھ اور کالرج نے صدیوں سے چلے آئے ادبی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے رومانویت کی اصطلاح متعارف کروائی۔ دونوں نے انگریزی ادب کو نہ صرف ناقدانہ نظریات دیے بلکہ اعلیٰ پائے کی شاعری بھی دی۔ یوں رومانویت ایک تحریک کی طرح سے پروان چڑھی جو در اصل یورپ میں سیاسی و سماجی اور معاشی عدم مطابقت کا رد عمل تھی۔ جان کیٹس، شیلے، لارڈ بائرن اور تھامس ہارڈی جیسے شعرا و ادبا سامنے آئے کہ جنھوں نے زندگی کو رومانوی نقطہ نظر سے پیش کیا۔ کسی نے نیچر کو موضوع بنایا یعنی فطرت پرستی کی تو کسی نے خوب صورتی کو اپنایا کسی نے ایسے سنہری دور کی خواہش کی کہ جہاں انسان اور جنگلی درندے اکٹھے ہوں تو کسی نے پر اسرار تخیلاتی و تصوراتی دنیا بسائی۔ کسی ناقد کا کہنا ہے کہ رومانویت کی کوئی ساڑھے گیارہ ہزار تعریفیں ملتی ہیں مگر کوئی ایک بھی موضوع کا احاطہ بھرپور طریقے سے نہیں کرتی ہیں۔ پروفیسر انور جمال رومانویت کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> "رومانویت زندگی کا ایسا مخصوص رویہ ہے جس میں آزاد خیالی، انا پرستی، لاابالیت خود پسندی اور بغاوت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ تخیل کی اس آزاد روی سے تخلیق کا ایک ایسا چشمہ پھوٹتا ہے جو منہ زور طوفان سے کم نہیں۔ رومانویت ایک طرح کا (Nostalgia) ہے جو مریضانہ مسلک رکھتا ہے۔ جس میں شعور اور سنجیدگی کے بجائے بے لگام خیال پروری اور عنائی عناصر کا غلبہ ہوتا ہے"(4)

بعض ناقدین رومانویت کو جمالیات کا مترادف قرار دیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک زبان و بیان کا حسن، لفاظی، صناع کاری اور رنگینی رومانویت ہے۔ اردو ادب میں رومانویت انگریزی ادب کی طرح سے باقاعدہ تحریک کی صورت میں نہیں ہے اور نہ ہی الگ دبستان بلکہ یہ ایک ایسی لہر ہے جو اول تو سر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کی بے جا مقصدیت، بلا کی حقیقت پرستی اور مدعانگاری کے فطری رد عمل کے طور پر سامنے آئی۔ دوم بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کی ترقی پسندیت اور جدیدیت کے جواب میں لہر کی طرح سے اٹھی۔ ادب برائے زندگی کے نعرے کے جواب میں ادب برائے ادب کا نعرہ لے کر اٹھی۔ یوں رومانویت پسند شعرا و ادبا نے زیادہ تر جمالیات کو مد نظر رکھا۔ کچھ نے روائتی عشق و عاشقی کے معاملات کا پرہ تان لیا جبکہ ایسے شعرا اور ادبا بھی اردو ادب کا زیور ہیں کہ رومانویت کے حوالے سے ان کی اپنی جداگانہ چمک اور آب و تاب ہے جیسے مفکر پاکستان، شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کا تصور خودی، تصویر مرد مومن، ماضی پرستی، فکر فردا اور اپنے مفکرانہ خیالات کو پیش کرنے میں شدت جذبات کا سہارا انھیں اردو کا سب سے بڑا رومانویت پسند ثابت کرتے ہیں۔ سلیم کوثر کے ہاں بھی وہ چند نمایاں خصائص بدرجہ اتم موجود ہیں کہ جن سے ان کی رومانویت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ سلیم کوثر کی رومانویت ان کے روائتی عشقیہ

موضوعات میں نظر آتی ہے۔ ایسے معاملات میں اکثر جذب و مستی کا اظہار کرتے ہیں کہ قاری سر دھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سر آئینہ میرا عکس ہے پس آئینہ کوئی اور ہے
میں کسی کے دست طلب میں ہوں تو کسی کے حرف دعا میں ہوں
میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے (5)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سلیم کوثر کی رومانویت کے متعلق رقم طراز ہیں:

"سلیم کوثر کی غزلوں میں ایک خاص طرزِ احساس موجود ہے۔ شعری تجربہ خواہ محدود ہی کیوں نہ ہو اور جسم کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے تو پھر ایک نئی نغمگی اور نئی معنویت جنم لینے لگتی ہے۔ سلیم کوثر کی غزل کے ارد گرد ایک عجب موسم جان کی عمل داری ہے۔ ہم جس قدر اس موسم جاں کے قریب آتے ہیں یا اس موسم جاں کے باسی بنا پسند کرتے ہیں۔ بہت سی ایسی الجھنوں کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں جو موسم جاں سے دور رہ کر لاینحل رہتی ہیں۔"(6)

سلیم کوثر کی شاعری میں ہر نوع کی تماثیل فراوانی سے مل جاتی ہیں ان کے ہاں اسلوب کا تنوع قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے، جس باصرہ۔ سامعہ، شامہ، ذائقہ اور لاسہ سے تعلق رکھنے والی دلکش تماثیل ان کی قدرت بیان کی مظہر ہیں۔ تجدید کی تجسیم ہو، مرکب تماثیل کی تخلیق ہو یا حسیاتی تمثال کی تشکیل، سلیم کوثر کے ہاں جدت اور تازگی کے امتزاج کے ساتھ موجود ہیں۔ روائتی عشق و عاشقی کے معاملات میں وہ بسا اوقات ایسی تمثیلات استعمال کر جاتے ہیں کہ ان کی رومانویت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ دیکھئے:

کیسی راہوں کے مسافر ہوئے ہم لوگ جہاں
سایہ آتا ہے کہیں اور نہ سراب آتے ہیں
شہر دل بارش گریہ سے نکھرتا ہے مگر

تیری یادوں کے خزانے تہہ آب آتے ہیں (7)

عشق و عاشقی کے معاملات کو پیش کرنے میں، یادِ رفتگاں یعنی ماضی کو یاد کرنے میں، مستقبل کی فکر کرنے میں اور امثالیت کی مختلف شکلیں پیش کرنے میں سلیم کوثر اچھے خاصے رومانوی ثابت ہوئے ہیں ان کے ہاں جذبے کی جو شدت ایک متحرک قوت کی حیثیت سے ہر سوچ اور فکر کے پیچھے موجود ہے وہ ان کی رومانویت کے لئے کافی ہے۔ اس اعتبار سے وہ قدما اور متاخرین کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں لیکن اگر رومانویت کو حقیقت سے فرار سمجھا جائے تو سلیم کوثر نے نہ ایسا کبھی کیا اور نہ کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ ہمعصروں کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں خصوصا جدیدیت و مابعد جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ ان کی رومانویت ایک طرف تو اردو ادب کی جاندار روایات کی پاسداری ہے تو دوسری طرف جدیدیت کی علمبر داری بھی۔

عصری و سیاسی شعور

ہر ادب اپنے زمانے کے اعتبار سے جدت اور جدیدیت کا علمبر دار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ماحول کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے جس طرح اردو غزل کو عصری و سیاسی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے اس سے ان کی غزل کو نہ صرف توانائی میسر آئی بلکہ نیا رنگ و آہنگ نصیب ہوا۔ سرسید احمد خاں کی سرپرستی میں چلنے والی علی گڑھ تحریک کی ادبی فکر و خیال نے بھی شعر و ادب کو عصری و سیاسی شعور سے روشناس کروایا۔ بیسویں صدی کے پہلے رہا پہلے ربع تک یہ اثر انتہائی نمایاں رہا جبکہ دوسرے ربع میں ترقی پسند تحریک کی بدولت اور تقسیم پاک و ہند کی وجہ سے شعر و ادب میں عصری و سیاسی شعور کی خوب ترجمانی ہوئی۔ اسی طرح سے جدیدیت و مابعد جدیدیت نے بھی عصری و سیاسی شعور و فکر کو فروغ دینے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سلیم کوثر کے ہاں ہمیں عصری و سیاسی شعور کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ خصوصاً اسّی (۸۰) کی دہائی میں ہونے والی قتل و غارت گری، زبوں حالی اور معاشی ابتری کا ذکر تو گویا سلیم کوثر کے ہاں نوحوں کی شکل میں ملتا ہے۔ دیکھیے کیسے اس عصری و سیاسی شعور کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کون تعبیر کی سوچے کہ سبھی قتل ہوئے
موسم خواب کی تفصیل بتانے والے
اب تو ساون میں بھی بارود برستا ہے یہاں

اب وہ موسم نہیں بارش میں نہانے والے (8)

تقسیم پاک و ہند، ہجرت اور فسادات بد قسمتی سے خارجی عوامل ہونے کے باوجود اہم ادبی فکری موضوعات رہے ہیں۔ پاکستانی ادبا و شعرا کی ایک بڑی اکثریت کو ہلو کے بیل کی طرح اسی فکر کے گرد اگرد گھومتی رہی ہے۔ سلیم کوثر بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ ان کی غزل میں پختگی قیام پاکستان کے کوئی نہیں سال بعد نظر آتی ہے مگر کراچی میں سندھی اور غیر سندھی ، مقامی اور مہاجر کا جو مسئلہ سر اٹھائے کھڑا تھا وہ کسی شیش ناگ کی طرح اپنا پھن پھیلائے عصری و سیاسی حالات کو کاٹ رہا تھا۔ چنانچہ سلیم کوثر کے ہاں ان عصری و سیاسی افکار کا جنم لینا فطری امر تھا۔ دیکھیے یوں گویا ہوتے ہیں:

ایک دن اپنی گواہی کے لیے ترسیں گے
اہل ہجرت کو پنبہ گیر بتاتے ہوئے لوگ (9)

بیسویں صدی کے آخری ربع میں متنوع عصری و سیاسی حالات کے تحت پاکستانی معاشرہ عجب نفسا نفسی اور گوں مگوں کی کیفیات میں سے گزر رہا تھا۔ سلیم کوثر کے ہاں اس کی ترجمانی ملتی ہے۔ بیسویں صدی کے اس آخری ربع میں سیاسی عدم استحکام، افراتفری، تفرقہ بازی، مذہبی و سماجی انتہا پسندی وغیرہ کے باوجود ملی اتحاد بر قرار رہا۔ سلیم کوثر نے اس عصری و سیاسی عمل کی طرف کیا خوب روشنی ڈالی۔

وہ برگ جن پر زتوں کے عذاب اترے تھے
شجر سے کٹ کے بھی موسم کے ترجمان رہے (10)

۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بچا کھچا پاکستان بدترین حالات سے گزرا مگر بچا رہا یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے، سلیم کوثر نے اس کی ترجمانی کی۔ کراچی ہی کے ابتر حالات کے بارے میں کچھ یوں گویا ہوتے ہیں۔

بے ہنر لوگ کہاں، حرف کی سچائی کہاں
اب کتابیں کسی دریا میں بہا دی جائیں (11)

سلیم کوثر کا عصری و سیاسی شعور اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا، انہوں نے ملک کے طول و عرض میں آنے والی ہمہ جہت تبدیلیوں کا نہ صرف بھرپور ادراک کیا ہے بلکہ ان تبدیلیوں کی ترجمانی بھی کی ہے۔

منصف وقت اب تجھے کیسا ثبوت چاہیے
شہر بجھا ہوا تو ہے آگ لگی ہوئی تو ہے (12)

سلیم کوثر منفی تبدیلیوں پر کڑھتے نظر آتے ہیں جب کہ مثبت تبدیلیوں کی حمایت میں آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں خصوصا اسی (80) کی دہائی سے آنے والے تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر ہے وہ اپنے ہمعصر شعرا کی طرح سے عصری و سیاسی شعور کا بھرپور ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔ خصوصا کراچی کے معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں ان کی انفرادیت بن چکی ہیں۔ کراچی کے سماج کے لیے سلیم کوثر نے جو اشعار کہے ہیں وہ شائد کسی اور ہم عصر کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔

سماجی شعور:

سلیم کوثر کے ہاں سماجی شعور کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں چھوٹے شہروں اور دیہات کا سادہ سماج بھی جھلکتا ہے جبکہ کراچی جانے کے بعد شہری زندگی کا سماج بھرپور طریقے سے سامنے آتا ہے۔ خصوصاً پچھلی چند دہائیوں سے کراچی میں جاری قتل و غارت گری کی بدولت سماج میں جو ڈر و خوف موجود تھا۔ سلیم کوثر نے اس کی بھرپور عکاسی کی ہے، کراچی جو منی پاکستان تھا، روشنیوں کا شہر تھا۔ اسے خوف و دہشت نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ سلیم کوثر جیسے حساس طبعیت کے مالک شاعر کے لیے یہ خوفناک صورت حال تھی۔ وہ جابجا اس سماجی کیفیات کو بے دھڑک بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

سلیم تنہائیوں کے آسیب روح تک میں اتر گئے تھے
مگر خدا جانتا ہے کب کا لیا دیا کام آگیا ہے (13)

کراچی کے اس دہشت زدہ سماج میں کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کون قاتل ہے اور کون مقتول، کون معصوم ہے اور کون مجرم۔ دیکھیے اس کیفیت کا اظہار کیسے کرتے ہیں۔

کس کی پہچان کریں کے مجرم سمجھیں
تو نگاہوں سے سے گزارے نہ گئے اصل چہرے (14)

پورے ملک میں کراچی کی ابتری کی وجہ سے ایسی ہی سماجی کیفیات پائی جاتی تھیں کہ جن کی بدولت سماجی رویوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ہر طرف نفسا نفسی، جھوٹ، دغا اور خود فریبی تھی۔ یہاں تک کہ مذہب کے نام پر منافرت اور تفرقہ بازی پھیلانا عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہاں البتہ سچ بولنا انتہائی مشکل تھا۔ سچ بولنے والے کے خلاف مشکلات و مصائب کا ڈھیر لگا دیا جاتا تھا۔ سلیم کوثر نے ان سماجی رویوں پر، مذہبی منافقت و منافرت پر بھی خوب طنز کے نشتر چلائے ہیں۔

نہ اہل دیر ہی خوش ہیں نہ جن سے اہل حرم
کچھ ایسے حرف ہیں میری زبان پہ بیٹھے ہوئے (15)

اکیسویں صدی میں دنیا گلوبل ازم کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ بے شمار ایسے رویے ہیں جو دنیا بھر میں بلا تمیز رنگ و نسل، قوم و ملت پائے جاتے ہیں۔ جیسے کسی اندوہناک حادثے کی شکل میں جان کھونے والوں کی یاد میں شمعیں روشن کرنا، اپنی آنکھیں اور اپنے جسم کے دیگر اعضا بعد از مرگ ضرورت مندوں کے لیے عطیہ کر جانا وغیرہ یہ در اصل انسانیت سے پیار کی نشانی ہے۔ سلیم کوثر ان مجموعی سماجی رویوں کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔

بجھنے لگ جائیں تو پھر شمعیں جلا دی جائیں
میری آنکھیں میرے دشمن کو لگا دی جائیں (16)

انسانیت نوازی کے اس عصر کی وجہ سے انسانی بھلائی اور سماجی فلاح و بہبود کا چرچا دنیا بھر میں ہے۔ بے شمار تنظیمیں اور گروہ این جی اوز کی شکل میں اس فریضے کو سر انجام دے رہی ہیں۔ پاکستانی سماج میں بھی دکھی اور پریشان انسانیت کی عدد ایک اہم سماجی رویہ ہے۔ سلیم کوثر کے ہاں اس کی عکاسی یوں ملتی ہے۔

سوئے ہوئے تو جاگ ہی جائیں گے ایک دن
جو جاگتے ہیں ان کو جگانا ہے اور بس (17)

ایک دوسرے کی مدد کرنا ایک دوسرے کی خاطر جینا مرنا ایک اہم سماجی رویہ ہے کہ جس کی بنیاد نبی صلی علیکم رحمت نے مواخات مدینہ کے دوران رکھی تھی۔ آج کے اس جدید دور میں بھی ایسی مواخات کی ضرورت و اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ دوسروں کے لیے ایثار و قربانی کا یہ جذبہ پاکستان سمیت تمام اسلامی دنیا میں رائج ہے۔ مغربی سماج نے بھی اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مواخات کے اس سماجی رویے کو اپنایا ہے۔ یوں یہ سماجی رویہ بھی عالمگیریت کا حامل ہے۔ سلیم کوثر کے ہاں اس کا اظہار کچھ اس طرح سے ہے۔

سلیم کوثر ، اگر یہاں کوئی جی اٹھا ہے تو جی اٹھا میں
اگر یہاں کوئی مر گیا ہے تو ساتھ مرنا پڑا مجھے بھی (18)

اسی طرح سے اپنے فطری و قدرتی ماحول کا خیال رکھنا اسے صاف ستھرا بنانا ماحولیاتی آلودگی کم کرنے کی اجتماعی کوشش کرنا بھی عالمگیر سماجی رویہ ہے۔ سلیم کوڑ اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کیا خوب گویا ہوتے ہیں:

پھولوں کو ڈھونڈتا ہوا پھرتا ہوں باغ میں
بادِ صبا کام دلانا ہے اور بس
آب و ہوا تو یوں بھی میرا مسئلہ نہیں
مجھ کو اک درخت لگانا ہے اور بس (19)

منفی سماجی رویے بھی ہر معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً پاکستان جیسے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں ایسے منفی سماجی رویے دیکھنے کو عام ملتے ہیں کہ جہاں نہ صرف ظلم و ستم کو قوت سے روا رکھا جاتا ہے بلکہ سیاسی و سماجی نظام کو بھی ظلم و ستم کے تابع کیا جاتا ہے۔ ایسے میں بھی بولنا، عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانا اور انصاف طلب کرنا بھی جرم بن جاتا ہے۔ سلیم کوثر نے ایسے منفی سماجی مگر طاقت ور رویہ جات کی خوب عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

تم نے سچ بولنے کی جرات کی
یہ بھی توہین ہے عدالت کی (20)

ایسے ہی منفی رویوں کو دیکھ کر سلیم کوثر کو بے ساختہ بے شمار مواقع میں اس کا برملا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ وہ سماج کے منفی پہلوؤں کو بھی منظر عام لانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک مقام پر کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

دنیا کو ابھی پتہ نہیں ہے
ہم میں کوئی پارسا نہیں ہے (21)

سلیم کوثر سماج کی ہمہ جہت تبدیلیوں کے بھرپور ترجمان ہیں انہوں نے کراچی جیسے بڑے شہر کے سماج میں آنے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے چھوٹے شہروں اور قصبات کے تبدیل شدہ سماج کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ دیکھتے ہوئے یوں بھی گویا ہوتے ہیں

کس قدر جھوٹ ہے باہر کی فضا
کتنا سچا ہے خدا آنکھوں میں (22)

سماج کس طرح سے عالمگیریت یعنی گلوبل ازم کی طرف بڑھ رہا ہے خصوصا بیسویں صدی کی آخری دہائی اور ملینیم کی تبدیلی سے اکیسویں صدی کے جو سماجی رجحانات پروان چڑھے، سلیم کوثر نے نہ صرف ان پر گہری نظر رکھی ہے بلکہ انہیں اپنے فکر وخیال میں لا کر خوبصورت لفظی پیکروں میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ جس سے نہ صرف ان کے ہاں جدیدیت ومابعد جدیدیت کو فروغ ملا ہے بلکہ ان کے ہمعصر سماجی فہم و ادرک میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس دور کے بڑے بڑے شعرا احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، عارف عبد المتین اور افتخار عارف وغیرہ بھی اس سماجی شعور کی ترجمانی میں اتنے واضح اور بے باک ثابت نہیں ہوئے سلیم کوثر نے اس حوالے سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔

حوالہ جات

1. عتیق الرحمان، سلیم کوثر بحثیت نظم گو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، 2013، ص5
2. سلیم کوثر، محبت اک شجر ہے، ویلکم بک ڈپو، کراچی، 1992، ص57
3. سلیم کوثر، خالی ہاتھوں میں ارض و سماء، ویلکم بک ڈپو، کراچی، 1999، ص565
4. انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلات، نشنیل بک فاؤنڈیشن، 2012، ص112
5. سلیم کوثر، یہ چراغ ہے تو جلا رہے، ویلکم بک ڈپو، کراچی، 1996، ص111
6. ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سلیم کوثر فن اور شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان، 2018، ص222
7. سلیم کوثر، محبت اک شجر ہے ، ص87
8. ایضاً، ص53
9. سلیم کوثر، یہ چراغ ہے تو جلا رہے، ولکم بک ڈپو، کراچی، 1996، ص129
10. سلیم کوثر، خالی ہاتھوں میں ارض و سماء، ص49
11. ایضاً، ص31
12. سلیم کوثر، دنیا میری آرزو سے کم ہے، ویلکم بک ڈپو، کراچی، 2000، ص244
13. سلیم کوثر، یہ چراغ ہے تو جلا رہے، ص136
14. ایضا، 123
15. سلیم کوثر، محبت ایک شجر ہے، ص124
16. سلیم کوثر، خالی ہاتھوں میں ارض و سماء، ص31
17. سلیم کوثر، دنیا میری آرزو سے کم ہے، ص535
18. ایضا، ص547
19. ایضا، ص546
20. سلیم کوثر، ذرا موسم بدلنے دو،، ویلکم بک ڈپو، کراچی، 1994 ص307
21. سلیم کوثر، خالی ہاتھوں میں ارض و سماء، ص27
22. ایضا، ص136